خدمت کی، آپ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سمجھانے کے لیے روازانہ نماز فجر کے بعد ایک گھنٹہ درس قرآن رکھا ہوا تھا۔ جس میں مسلمان مردوں کے علاوہ علیحدہ باپردہ جگہ میں خواتین بھی شریک ہوتی تھیں، علوم عربیہ کے فارغ التحصیل علماء کے لیے قرآن کی تفسیر پڑھائی جاتی اور اس درس کی تکمیل کے بعد جو حضرات مزید تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے آپ انہیں چار ماہ میں فلسفہ، شریعت اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' پڑھاتے ۱۹۴۰ء سے شروع ہونے والا یہ درس آپ کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، حضرت امام لاہوری کا یہ درس قرآن عوام کے لیے ہوتا تھا لیکن وہ علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ان کی سطح پر بھی درس قرآن کریم کا اہتمام کرتے تھے اور اس کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ وفکر، خاص طور پر ان کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تعلیم و تدریس بھی ان کے اس مشن کا حصہ تھا، ان سے اس دوران قدیم و جدید طبقات سے تعلق رکھنے والے ہزاروں ارباب علم نے استفادہ کیا جن میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، علامہ علاؤ الدین صدیقی اور ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا سرفراز خان صفدر، مولانا صوفی عبد الحمید سواتی، مولانا قاضی زاہد الحسینی، مولانا شیر علی شاہ مدنیؒ، مولانا عبدالحلیم (دیر بابا)، مولانا سمیع الحق مدظلہ جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

قرآن فہمی میں ان کا طرز حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح حالات زمانہ پر قرآن کریم کی آیات و احکام کی تطبیق کا تھا اور وہ دورِ حاضر کی اصطلاحات و ماحول کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کے ساتھ ساتھ عقلی و منطقی تعبیرات و تاویلات (الاعتبار والتاویل) بھی پیش کرتے تھے جس پر ابتدا میں بعض اہل علم کی طرف سے تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا لیکن دھیرے دھیرے دینی حلقے اس طرز سے مانوس ہوتے چلے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت لاہوری کا یہ حلق درس جنوبی ایشیا کی سطح پر فہم قرآن کریم کے بڑے مراکز میں شمار ہونے لگا۔ حضرت امام لاہوری کی وفات کے بعد بھی قرآن فہمی یہ سلسلہ ان کے شاگردوں، جانشینوں نے جاری رکھا

ترجمہ قرآن کا آغاز

۱۹۱۵ء میں شیخ الہند نے مولانا سندھی کو کابل بھیجا تو پیچھے دہلی کا سارا نظام آپ کے سپرد رہا اور تحریک ریشمی رومال میں آپ بھی گرفتار ہوگئے، رہائی کے بعد آپ لاہور آتے ہی درس قرآن کی ابتدا کردی، مولانا سندھی سے وعدہ کیا تھا کہ اشاعت قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ انہوں نے ترجمہ قرآن کے تحریری کام باقاعدہ آغاز ۱۹۲۵ء میں کیا اور آپ تجویز کے مطابق واہ تشریف لے گئے جہاں اس ترجمہ کی تکمیل ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں مترجم وحشی قرآن شائع ہوگیا، ۱۹۲۴ء میں انجمن خدام الدین کی نگرانی

میں مدرسہ قاسم العلوم کا قیام عمل میں لایا گیا اس میں سالانہ نصاب کے علاوہ تفسیر کا سہ ماہی نصاب بھی شامل تھا، اس سہ ماہی کورس کے لئے شیخ الاسلام مدنی طلبا کو ترغیب دیا کرتے تھے جبکہ بڑے بڑے علماء سفارشی خطوط دے کر طلبہ کو لاہور بھیجتے، مولانا علی میاں بھی لاہور میں آپکے پاس قرآنی علوم و معارف کے حصول اور تربیت و تزکیہ کی منازل طے کرنے کیلئے کچھ عرصہ شیرانوالہ گیٹ لاہور میں مقیم رہے آپ نے حضرت لاہوری کی نجی، عوامی اور علمی زندگی کا مشاہدہ کر کے ان کی درویشی، حق گوئی، فہم قرآن اور للّٰہیت اور خشیت اور اخلاص کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور بہترین تاثرات قلمبند کر کے قارئین کے سامنے پیش کی۔

مولانا لاہور کا طرز و اسلوب درس قرآن

آپ کا علوم و افکار ولی اللہی سے گہرا تعلق ہے اسلئے آپ شاہ صاحب کے فکر و فلسفہ کی روشنی میں طلبہ کو قرآن کی تعلیم دیتے رہے آپ نے اس حوالہ سے ایک مخصوص طرز اختیار کیا تھا جس میں طلبہ کو امہات تفاسیر کے مطالعے کیساتھ ساتھ فہم قرآن میں سورت کا خلاصہ، ربط ایات وسور، خلاصہ رکوع مع ماخذ اور دیگر نکات قرآنی پر مشتمل تعلیم دیتے تھے اس کے نتیجے میں طلبہ میں قرآن کریم کے مضامیں سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو جاتی تھی، عربی مدارس کے طلبہ کیلئے ترجمہ اور تفسیر کی تعلیم کا مختصر پروگرام بنا رکھا تھا جس میں طلبہ کے اندر قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھرپور صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی اور اس نصاب کی تدریس میں اسکا علمی تنوع، تعمق اور اثر پذیری خوب تھی، اس مدت میں مولانا نے علماء عربی کو قرآن کے علوم و معارف پر عبور حاصل کرا دیا کرتے تھے اور قرآنی جواہر پر اظہار خیال کی جرات پیدا کر دیا کرتے تھے، عربی کی امہات تفاسیر سے اس طرح تعلق خاطر پیدا کر کے قرآنی ذوق کی آبیاری کی جاتی تھی اور دوران درس تلامذہ کو یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ کوئی نہ کوئی تفسیر اپنے مطالعے میں خاص طور پر رکھیں اور یہ بھی ہدایت کی جاتی تھی کہ تقریر درس قلمبند کیا جائے اور جو کچھ بتایا جاتا ہے، اسکو ضبط ذہن کر لیا جائے، مولانا کا خاص طرز یہ تھا کہ پوری سورت کو ایک مجموعی مضمون قرار دیتے اور اس پر بطور خلاصہ تقریر فرماتے پھر ہر رکوع کا مستقل خلاصہ کی صورت میں ایک مضمون بناتے اور پھر ماخذ پر روشنی ڈالتے کہ فلاں آیات تک یہ مضمون مذکور ہے اور خصوصا ربط آیات کو خصوصیت سے پیش فرماتے اور قرآنیات کو دور حاضر پر منطبق کرنے کی طرف توجہ دلاتے اسی طرح دوران درس بطور تاویل اور بطور اعتبار اجتماعیات کیلئے سیاسی اور عمرانی نکات مستنبط کرتے تھے، ان کی تفسیر میں عصر حاضر سے تعلق کی بنا پر قرآن زندہ اور رہنما کتاب عملاً دکھائی دیتی ہے اللہ کی یہ کتاب زمانہ حال کے عمرانی، سیاسی، معاشی اور فکری مسائل کے حل کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔

تفسیر امام لاہوریؒ کی نمایاں خصوصیات اور بنیادی اسلوب

حضرت لاہوری کا ترجمہ اور تفسیر دعوتی، فکری اور فلسفہ ولی اللہی کے اسلوب کے حامل ہے جس میں قرآن کریم کے نظریہ تربیت وتعلیم کے ساتھ ساتھ انفرادی کردار کی تعمیر کے لوازم اور اجتماعیت کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی ہے اور عقائد معاملات، عبادات، تدبیر منزل، تزکیہ واحتساب نفس اخلاق عالیہ کی ترویج وتکمیل، رذائل سے اجتناب و دوری کی تلقین، انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کا تعین، معیشت و اقتصاد، جہاد اسلامی کی اہمیت، سیاست واجتماعیت کو مربوط انداز پر ایک جامع نظام فکر وعمل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور بالخصوص علوم ولی اللہی سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔

۱: خلاصہ سورت

امام کمال بصیرت کے ساتھ اولا ہر سورت کا خلاصہ اور مرکزی مضمون از حد اختصار کے ساتھ بیان فرماتے ہیں ان کے بیان کردہ خلاصہ جات رکوع وسورت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ کس قدر لطیف وعمیق ہے؟ دیکھنے والا ہی ان لطائف کا اندازہ کرسکتا ہے، مخصوص احوال کی رکوع وسورت کے نتائج بھی بیان فرماتے ہیں اور اس کے لطیف نکات سے انسان محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور قرن اول سے متعلق آیاتوں اور سورتوں کا انطباق حالات حاضرہ بھی بخوبی کرتا ہے، اس طرح مخصوص عنوان کی بدولت ہی پوری سورت کا جامع خلاصہ سامنے آجاتا ہے، حالات حاضرہ پر انطباق وتطبیق سے اس کی جامعیت سمجھ میں آجاتی ہے کہ آج بھی جو فرد یا طبقہ اسی طرح کے اعمال مرتکب ہوتا ہے، آج بھی اسی کا انجام پہلے والوں کی طرح ہوگی اس طریقہ پر سور قرآنیہ سے اصولوں کا استخراج واستنباط اور ان کا انطباق آپ کے نمایاں خصائص تفسیر میں سے ہے

۲: موضوع سورت

سورتوں کے خلاصہ کے ساتھ ساتھ آپ اکثر جگہ سورتوں کے مرکزی موضوع کا تعین کرتے ہیں جو بڑا معنی خیز اور جامع ہوتا ہے، کسی جگہ مختصر عنوان دے دیتے ہیں جو سورت کے جملہ مشمولات کا احاطہ کیے ہوتا ہے، آپ کی قرآن فہمی کا ایک خاصہ یہ ہے کہ بڑے جامع انداز میں سورت کا موضوع متعین کرتے ہیں جو سورت میں مذکور آیات کا مقصود وخلاصہ ہوتا ہے، آیات کا دیگر متعلقہ موضوعات کا بخوبی خلاصہ خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اس میں جو صوری ومعنوی ربط ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں دیگر موضوعات سور بھی اسی طرح کی تفسیری لطافتوں کے حامل ہیں

۳: ربط آیات

امام لاہوری ربط آیات کا اہتمام سب سے زیادہ کرتے ہیں، خلاصہ رکوع اور ہر دو رکوع یا موضوعات کے درمیان بامعنی وحکیمانہ ربط پیدا کردیتے ہیں اس ربط کی تفہیم کے سبب کئی اشکالات از خود رفع ہوجاتے ہیں اور قرآن کریم ایک مسلسل ومربوط کلام دکھائی دیتا ہے۔

۴: خلاصہ رکوع

امام لاہوری ہر رکوع کا خلاصہ بڑے التزام کے ساتھ محض چار پانچ لفظوں میں لکھتے ہیں امام لاہوری کے درس قرآن کی خصوصیت اور قرآنی بصیرت کا اندازہ ان کی خلاصہ رکوعات سے لگایا جاسکتا ہے، اس طریقہ تفہیم کی بدولت قرآن مجید کا ہر رکوع ماقبل و مابعد سے مربوط ہوجاتا ہے اور اس ربط کی بدولت بہت سے اشکالات از خود رفع ہوجاتے ہیں اور قرآن فہمی کا سفر آسان ہوجاتا ہے۔

۵: تصحیح عقائد اور اصلاح رسوم

امام لاہوری کے دورس قرآن دو انداز تھے، ایک عوام الناس کیلئے جس میں اصلاحی اور اجتماع انداز غالب تھا، دوسرا علماء کرام کیلئے، عمومی، درس برصغیر کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گیا تھا، مولانا چونکہ حق گوئی اور استقامت کا پرتو تھے، تو وہ ہر دو دورس قرآن میں تصحیح عقائد کا قرآنی اسلوب میں کرتے تھے، ہر طرح کے باطل ادیان کا رد قرآن وسنت اور افکار شاہ ولی اللہ کے روشنی میں پیش فرماتے تھے اور اسی طرح موجودہ باطل نظریات کا بھی پردہ چاک کرکے اس کا اسلامی محاکمہ پیش کرتے تھے اور علاقائی غلط رسوم و بدعات کا تردید بھی نہیں مصلحانہ انداز میں پیش فرماتے تھے اور وقت کے حکمرانوں کی غلط روش پر ان کی اصلاح احوال پر بھی توجہ دیتے تھے اور پوری جرأت کے ساتھ خیر خواہانہ نصائح فرماتے چونکہ مولانا کی زندگی خدا ترسی قرآن فہمی حب رسول اور انسان دوستی کی تابندہ مثال تھی اور اس کے ساتھ درویشی، استغنا اور حق گوئی بھی انکا وصف خاص تھا انگریز استعمار پر نقد ورد پاکستانی حکمرانوں کے غلط اور خلاف شرع اقدامات پر تنقید وہ بلاخوف لامۃ لائم فرماتے تھے

۶: فقہی مسائل کا استنباط

امام لاہوری عالم اجل تھے فقہ میں ان کی دلچسپی تھی اور بالخصوص فقہ حنفی کے فلسفہ اور اس کے اصولوں کے ماہر ومتخصص تھیں اس لئے جہاں قرآن مجید میں انسانی مسائل سے متعلق آیات آتی ہے وہاں مولانا اپنے مخصوص انداز سے فقہی مسائل کا استنباط کرتے ہیں مثلا عائلی زندگی کے حوالے سے نکاح رضاعت طلاق اور میراث وغیرہ امور میں مولانا مسائل کی نوعیت کے اعتبار سے فقہی استنباط اور فقہ حنفی

کے اصولوں سے استخراج نتائج کرتے ہیں، ان مسائل میں کبھی آپ فقہاء احناف کی رائے کی تائید کرتے ہیں اور کبھی اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور بعض مقامات پر فقہاء احناف کے موقف و دلائل کے راجح ہونے کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ آپ بتاتے ہیں کہ فقہ حنفی کو ان ان معاملات میں قرآن کی موئدات میسر ہیں ایسے میں مولانا کا فہم قرآن اور فقہی تفہیم کی وسعت بیک وقت ہمارے سامنے آتی ہے اور مولانا اپنے خاص کلامی انداز میں آیات قرآنیہ اور فقہ حنفی کے فلسفہ میں توافق اور تطابق پیدا کرتے ہیں ایسے میں متعلقہ آیات کی توضیح کے حوالے سے آپ کے تفسیر کا عنوان مسائل مستنبط ہوتا ہے، مولانا خود ایک اجتماعی فکر رکھتے تھے اس لئے وہ فقہی مسائل سے اجتماعی و سیاسی استدلال بھی پیش کرتے ہیں اور عائلی مسائل اور اجتماعی و سیاسی معاملات میں کس لطافت کے ساتھ موافقت و مطابقت پیدا کرتے ہیں

۷: حکیمانہ انداز

قرآن کریم کی اپنی ایک الگ شان ہے اس کے مباحث میں جو اشارے اور کنائے ہیں ان کو سمجھنا اور ان کی ایسی توجیہ کرنا جو دافع اشکال ہو اور قاری قرآن کو اطمینان قلبی کی کیفیت بھی عطا ہو اس تفسیر میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں امام لاہوری قرآنی مقامات کی ایسی حکیمانہ توضیح کرتے ہیں جو دافع اشکالات ہوتی اور مقام کو نہایت حکیمانہ بصیرت سے حل فرماتے ہیں۔

۸: علوم ومعارف ولی اللہی کی ترجمانی

امام لاہوریؒ خصوصی وصف جو انہیں اپنے معاصرین سے اُسے ممتاز کرتا ہے وہ شاہ ولی اللہ کی قرآن ی بصیرت کو اول تا اخر اپنے اندر سمو لینا ہے، چنانچہ آپ کی تفسیر میں شاہ صاحب کی فکر کا عکس غالب ونمایاں ہے شاہ صاحب کی مخصوص قرآنی اصطلاحات جیسے تذکیر بالا اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر بالموت وبمابعد الموت اور مخاصمہ بالیہود، مخاصمہ بالنصاری، جابجا نظر آتی ہے، تفسیر میں مولانا کو جہاں بھی شاہ صاحب کی وسعت فکر ونظر اور اجتماعی نظم وسیاست کے حوالے سے نکات ملے مولانا ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالتی ہے

۹: ولی اللہی علوم ومعارف سے خصوصی استفادہ کے اثرات

شاہ صاحب کی فکر وفلسفہ میں جو وسعت، تعمق اور جامعیت کی شان ہے، اس سے استفادہ کے سبب دین کے ہر شعبے کی جامع تعبیر کی جاسکتی ہے جس کی بدولت باہمی انتشار وافتراق پر قابو پاکر معاشرے کی عملی فکری اور اصلاحی و جامع تعمیر وتطہیر کی جاسکتی ہے مولانا لاہوری چونکہ مولانا سندھی کے شاگرد ہیں، اسلئے

امام لاہوریؒ کے ہاں علوم ومعارف ولی اللہی سے اخذ واستفادہ وسیع بنیادوں پر کیا جاتا ہے کہیں معیشت و اقتصاد کی بحث ہو یا اجتماعیت و سیاست کا کوئی شعبہ ہو اس کی درس وتفسیر میں فکر ولی اللہی پس منظر میں صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ شاہ صاحب جس طرح فلسفیانہ انداز میں بات سمجھاتے ہیں اور مسلسل عقلی دلائل دیتے ہیں امام لاہوری بھی ان کے تتبع میں اسی طرح کا کلامی اور عقلی انداز اختیار کرتے ہیں۔

۱۰: شاہ ولی اللہ جیسا تطبیقی انداز اور اسلوب

مختلف ومخالف آراء میں باہم مطابقت پیدا کرنا شاہ صاحب کا خاص فن ہے کبھی کبھی یہ تطبیق فقہی معاملات میں پیش آتی ہے اور کہیں فہم قرآنی میں اس میں ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جو جدت وندرت کے ساتھ ساتھ دین ودنیا میں مطابقت پیدا کردے امام لاہوری بھی اسی انداز سے پیش فرماتے ہیں کہ تمام اہل علم اسے تسلیم بھی کرتے ہیں

۱۱: شاہ ولی اللہ کی علمی اصطلاحات کا استعمال

امام لاہوری کا قرآنی بصیرت کے حوالے سے ایک خصوصی مرجع شاہ صاحب کی ذات گرامی ہے، ان کی فکر کا عکس مولانا لاہوری کے ہاں بدرجہ اتم واکمل پایا جاتا ہے، اور شاہ صاحب کی اصطلاحات کو اکثر جگہ استعمال کیا جاتا ہے مولانا لاہوری اپنے درس قرآن اور ترجمہ میں اس کا خاص لحاظ رکھتے ہیں جیسے الفوز الکبیر میں علوم خمسہ کی اصطلاح اور شاہ صاحب کی دیگر جامع اصطلاحات کو اپنے درس میں جابجا استعمال کرتے ہیں جس کثرت وتواتر سے اپ نے ولی اللہی اصطلاحات کا استعمال اور ان سے استفادہ کیا ہے شاید ہی کسی دیگر مفسر نے اس وسعت کے ساتھ اخذ واستفادہ کیا ہو۔

۱۲: مخاصمہ کا ولی اللہی انداز

الفوز الکبیر میں مذکور علوم خمسہ میں ایک علم علم المخاصمہ بھی ہے جس میں شاہ صاحب نے مخاصمہ بالیہود، مخاصمہ بالنصاری اور مخاصمہ بالمنافقین کے انداز کی وضاحت اور اسکی متعدد قرآنی امثلہ پیش کی ہیں امام لاہوریؒ نے اپنے درس تفسیر میں کہیں مخاصمہ کی اصطلاح استعمال کی ہے اور کہیں اس مخاصمہ کے انداز سے استفادہ کیا ہے بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ جیسے علوم ولی اللہی سے استنباط کیا جارہا ہے بعض مقامات میں جامع اختصار کے ساتھ علوم ولی اللہی سے استفادہ صاف نظر آرہا ہے، اسی طرح منافقین اور نصاری کے ساتھ ولی اللہی انداز کے مخاصمے کی کئی امثلہ آپ کی تفسیر میں موجود ہیں۔

''تفاسیر امام لاہوری'' کو مرتب کرنے کا عزم اور مولانا سمیع الحق مدظلہ کی سعادت

امام لاہوری کے درس قرآن اور تفسیر اپنی گوناگوں خصوصیات خلاصہ سورہ ورکوع، استنباط مسائل،

نظم قرآن کے اہتمام اور شاہ ولی اللہ کے افکار سے استفادہ کے سبب بہت جامع مانع اور ہمہ گیر ہیں ان کی تفسیر کی ایک خصوصیت نئے قرآنی عنوانات قائم کرنا ہے جن میں ندرت فکر کے ساتھ ساتھ اتنی تازگی ہے کہ وہ آج کے حالات پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں، اس طرح کے متعدد عنوانات، استنباط فکر کی ندرت کے سبب بڑے منفرد ہیں بایں وجوہ یہ تفسیر ایک طرف اسلاف کی فکر کا نمائندہ ہے، دوسری جانب آج کے حالات میں بھی ہماری بھر پور رہنمائی کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ امام لاہوری کے دورس کو تحریری شکل میں پیش کر کے امام لاہوری کی قرآنی فکر کو عام تر کیا جائے تا کہ معاشرے کے اندر ایک فکری وسعت اور کشادگی پیدا ہو، اور امام لاہوری کے علوم و معارف تک ہر عام و خاص کی رسائی ہو، مولانا اپنی تفسیر میں عالمگیر و آفاقی حقائق اور قرآنی تعلیمات کو اس طرح ساتھ ساتھ لے کر اس پر روشنی ڈالتے ہیں تا کہ قرآنی نتائج فکر کسی عقلمند اور زیرک انسان کے لئے اجنبی نہ رہیں، شاہ صاحب کی فکر اصل میں اسی عالمی آفاقی انقلاب کی علمبردار ہے اور مولانا لاہوری اسی فکر کے معتمد شارح ہیں ۔ درسِ قرآن کریم کی یہ خصوصیات دیگر شیوخِ تفسیر کے دورہائے تفسیر میں شاید نہ مل سکے، اس لیے اس بات کی اشد ضرورت اور وقت کا تقاضا بھی تھا کہ لاہوری کے تفسیری افادات کو اس انداز سے منظر عام پر لایا جائے۔ جیسا کہ اس کا انداز و اسلوب درس تھا تا کہ علوم ولی اللہی کے اس معتمد شارح کے افادات سے تشنگان علم تفسیر سیراب ہو سکے اور یہ خدمت امتِ مسلمہ کے لیے بالعموم اور علماء وطلباء دین کے لیے بالخصوص تعلیمی و تدریسی میدان میں عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور قرآن کریم کے دروس کے نام پر بعض ماڈریٹ طرزِ تفسیر اور عامیانہ تجدد پسندی کی لغویانہ حرکتوں سے نجات بھی مل جائے گی، اور یہ اس دور فتن میں ایک نعمت سے کم نہ ہوگی اس تشنگی اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے امام لاہوری کے مایہ ناز شاگرد، شیخ المشائخ مولانا عبدالحق کے فرزند ارجمند، مہتمم جامعہ حقانیہ استاد گرامی مولانا سمیع الحق مدظلہ نے اس تفسیر کو مرتب کرنے عزم کیا، چونکہ امام لاہوری کے دورہ تفسیر سے مستفید ہونے والے ممتاز شاگردوں میں سے آپ کے نامور شاگرد، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہم بھی تھے، جنہیں اللہ تعالی نے بے پناہ عملی مشاغل کے باوجود علمی دنیا کے بلند مقام سے نوازا، جسے محض حق تعالی شانہ کا فضل اور مولانا موصوف کے عظیم، باکرامت ولی، پدر مکرم مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ کی زندہ کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔

۱۹۵۸ء انہوں نے حضرت امام لاہوریؒ سے دورہ تفسیر پڑھا تھا، دورانِ درس آپ کے تفسیری افادات کو جمع بھی فرماتے رہے جو ایک مجموعہ کی شکل میں محفوظ ہو گئے تھے، اس مجموعہ کو مرتب و مدون کرنے کا دیرینہ داعیہ جب روبعمل ہونے لگا، تو اس مجموعہ کے سن تسوید سے دو چار سال قبل اور دو چار سال بعد کی آمالی سے استفادہ بھی کیا گیا اور حسبِ ضرورت حضرت لاہوریؒ کے مطبوعہ علمی افادات سے رہنمائی بھی لی

گئی، اس طرح یہ مجموعہ بحمد اللہ تیاری کے مراحل میں ہے، محنتِ شاقہ کا یہ ثمرہ تقریبا ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہوگی، جسے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے الہامی ولدنی افادات سے آراستہ اور مولانا عبید اللہ سندھی کے الاعتبار والتاویل سے معمور ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہوگا۔ان شاء اللہ

تفاسیر امام لاہوری کی ترتیب میں مولانا سمیع الحق کا نہج واسلوب وطریق کار

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ایسا ناپید کنار ہے کہ جس میں غوطہ زن ہونے والے ہر دور اور ہر زمانے میں نت نئے موتی اصحاب ذوق کی خدمت میں پیش کرتے آرہے ہیں، اور قیامت تک یہ سلسلہ مبارکہ بدستور اسی طرح جاری وساری رہے گا، سینکڑوں پہلوؤں کے متعلق قرآن کریم کی تفسیر میں دنیا کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں کی تعداد میں لکھی گئی ہے اور تاہنوز لکھی جارہی ہے، مگر تشنگی کا احساس بدستور باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

ولی کامل ،زینت المحدثین ،شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالحقؒ مرقدہ کے قابل فخر فرزند ارجمند استاد مکرم شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ بھی اس کار خیر کے اس مبارک سلسلہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل کرتے ہوئے حضرت امام المفسرین مولانا احمد علی لاہوری کے تفسیری افادات کو ''تفاسیر امام لاہوری'' کے نام سے مرتب ومدوّن کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور یہ گراں قدر علمی وتفسیری خدمت تھی جس کا شرف اور اس کو مدون کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق مدظلہ کے حصے میں ڈالی ورنہ امام لاہوری کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہیں اور امام لاہوری نور اللہ مرقدہ سے اس دور کے قابل قدر شاگردوں اور تلامذہ نے ان کے دورہائے تفسیر یہ میں شرکت کرکے علم التفسیر کا فیض حاصل کیا جس میں چند نمایاں اور قابل ذکر نام گرامی علماء درج ذیل ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا سرفراز خان صفدر، مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، مولانا مفتی محمود، مولانا علامہ علاؤ الدین صدیقی ،مولانا عبدالحلیم دیر بابا، مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ مدنی ، مولانا معین الدین لکھوی وغیرہ شامل ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جلیل القدر خدمت کے لئے فرزند حقانیہ مولانا سمیع الحق مدظلہ کو چنا اور موصوف سے یہ خدمت لی، مولانا سمیع الحق مدظلہ اس تفسیر کو تمام جہات سے جامع بنانے کے لئے بھرپور کوشش اور سعی کی ہے اسی بناء پر اس تفسیر کو ''جامع التفاسیر امام لاہوری'' یا ''علوم لاہوری کا انسائیکلوپیڈیا'' بھی کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سمیع الحق مدظلہ امام لاہوری کے افادات تفسیر ہے اور فرمودات قرآنیہ کو یکجا کرے ایک گنج گراں مایہ کی شکل میں عاشقان کلام الٰہی اور مشتاقان قرآن کے لئے ایک حسین وعظیم تحفہ پیش کریں گے، چونکہ افادات و دروس امام لاہوری ممتاز خصوصیات کی حامل ہیں جس کو بالتفصیل ذکر کردیا گیا ہے، لیکن

ضروری اور مناسب یہ ہے کہ ''تفاسیر امام لاہوری'' میں مولانا سمیع الحق مدظلہ نے اس کی جمع و تدوین میں جن اصول وقواعد، اسلوب ونہج اور خصوصیات ومزایا کی رعایت رکھی ہے اور جن اوصاف کے یہ حامل ہے اس پر روشنی ڈالی جائے، ذیل ان خصوصیات کو مختصراً ذکر کیا جائے گا۔

۱: آیات کریمہ کا ترجمہ وتفسیر میں مولانا سمیع الحق مدظلہ کا اسلوب یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ مکمل رکوع (متن) ذکر کر کے رکوع میں موجود تمام آیاتوں کا ترجمہ بین السطور میں حسن ترتیب سے لگاتے ہیں اور اس اہتمام میں بھرپور احتیاط سے کام لیا جاتا ہے، اور اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ بھی خود امام لاہوری کا ہے۔

۲: اس کے بعد امام لاہوری کے طرز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رکوع کا خلاصہ نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں اور ذیل میں ماخذ کا ذکر کرتے ہیں۔

۳: ہر آیات پر معنی خیز اور جامع عنوان لگا کر ہر ایک آیات کا ایک جامع خلاصہ اس عنوان میں سمیٹنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

۴: آیات کریمہ کے ذیل میں بعض مرتبہ تفصیلی مباحث اور بعض علمی اور مبینہ نکات اور باتیں بھی مستقل اور جامع عنوان کے متقاضی ہوتے ہیں تو مولانا سمیع الحق مدظلہ اس پر مستقل عنوان لگاتے ہیں۔

۵: امام لاہوری کی طرز و الفاظ میں کمی وبیشی نہیں کرتے بلکہ بھرپور علمی دیانت وامانت کا حق ادا کرتے ہوئے امام لاہوری کے افادات کو من وعن پیش کرنے کا بھرپور اہتمام کرتے ہیں۔

۶: چونکہ امام لاہوری کا ماخذ شاہ ولی اللہؒ ہے تو جہاں جہاں امام لاہوری نے شاہ صاحب کی کتابوں خصوصاً حجۃ اللہ البالغۃ کا ذکر یا اس کا کوئی عبارت بیان فرمایا ہے تو وہی مولانا سمیع الحق مدظلہ نے حواشی میں وہ تمام عبارت نہایت خوش اسلوبی سے لگا کر حسن تالیف میں اضافہ کر دیا ہے۔

۷: تفسیر امام لاہوری کی تیاری ان مسودات سے کی جارہی ہے جو مولانا سمیع الحق مدظلہ نے امام لاہوری سے چالیس پچاس سال پہلے لکھی تھی، لہٰذا ان مسودات کے بعض صفحات نہایت بوسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں بعض مقامات پر اگر کہیں ابہام کی صورت پیش آتی ہے تو ابہام کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور اس جگہ پر مزید تفصیل کیلئے شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی کی فوائد عثمانیہ سے حاشیہ لگا کر اس ابہام کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

۸: چونکہ ''تفاسیر امام لاہوری'' ایک دائرہ المعارف اور علوم امام لاہوری انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے تو ہر ایک رکوع میں جہاں جہاں بعض آیاتوں میں ان مسودات کے علاوہ امام لاہوری نے اپنے خطبات یا مجالس میں ان باتوں پر کہیں کچھ روشنی ڈالی ہے تو مولانا سمیع الحق مدظلہ نے نہایت سلیقے سے ہر رکوع کے بعد تحریری افادات (جو خالصتاً امام لاہوری نے از خود تیار کی ہے) وہ لگاتے ہیں، اس کے علاوہ

جہاں کہیں کسی آیات پر انہوں نے کسی مجلس میں روشنی ڈالی ہے تو اس آیات کے رکوع کے آخر میں مجلسی افادات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

۹: مولانا سمیع الحق مدظلہ نے اس کی ترتیب وتدوین میں زیادہ غوروخوض سے کام لیا ہے وہ پیرانہ سالی اور دیگر مشاغل کے باوجود رات دن ایک کرکے اس کی تصحیح وعنوانات لگانے میں مشغول رہتے ہیں، اور مسودات چیک کرنے میں منہمک رہتے ہیں، ان شاء اللہ اس میں کسی ایسی بات کی گنجائش نہ ہوگی جس پر کل کلاں کو انگلی اٹھا سکیں، نہ اس میں حقائق سے ہٹ کر کوئی بات ہوگی صداقت کو صداقت کی طرح پیش کردیا گیا ہے۔ان شاء اللہ اس تفسیر سے ہر مسلک پر طبقہ کے متوسلین فائدہ اٹھائیں گے۔

۱۰: انداز بیان میں سادگی، ندرت اور علمی چاشنی جگہ جگہ محسوس ہوگی، امام لاہوری کے الفاظ کا بھرپور احتیاط کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے۔

۱۱: تفسیر میں موجود احادیث مبارکہ کی امہات کتب سے تخریج کی گئی ہے۔

۱۲: تفسیر چونکہ تیاری کے مراحل میں ہے اور مسلمانان عالم او راہل علم اس کے منظر عام پر آنے کی شدت سے انتظار کررہے ہیں، تو مولانا سمیع الحق مدظلہ نے موجودہ زمانے کے اکابر واہل علم سے ان کی توثیق وتقریظ کیلئے برصغیر کے نامور علماء ومفسرین کو ایک مسودہ تیار کرکے ان کی خدمت میں پیش کیا ہے تاکہ اس پر اپنے تاثرات قلمبند کریں، لہٰذا اس میں اہل علم کے تاثرات بھی شامل ہوں گے۔

آخر میں ایک بات تحدیث بالنعمت کے طور پر ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس خدمت کو اپنے لئے سعادت مندی سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سمیع الحق مدظلہ نے اس قابل سمجھا کہ میں ان کے ساتھ اس تفسیر میں معاونت کروں، میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اس کام میں پورے اخلاص کے ساتھ اس پر کام کرسکوں۔یہ میرا کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی ہے.....

ایں سعادت بزور نیست
تانہ بخشند خدائے بخشند

اب اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم الشان تفسیری کاوش کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچائے اور مولانا سمیع الحق مدظلہ کی عمر میں برکت ڈالے تاکہ اس عظیم الشان علمی جواہر پارے سے مسلمانان عالم مستفید ہوسکے۔

پروفیسر محمد رشید ارشد *

فلسفے کی مذہبی ضرورت

فلسفہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔سقراط کے نزدیک یہ موت کی تیاری کا عمل ہے۔(۱) افلاطون کی رائے میں فلسفہ چیزوں کی تحدید وتعریف کا نام ہے۔(۲) کلاسیکی روایت میں فلسفہ اصلا مابعد الطبیعیات کا نام تھا۔سب سے اہم سوال یہی تھا کہ وجود اپنی اصالت اور مظاہر میں کیا ہے۔ایمان کی اولین مخاطب عقل ہے ۔انسان کا اصل شرف یہ ہے کہ وہ عقل رکھتا ہے جس کے بارے میں امام غزالی کا یہ کہنا کہ عقل ایک ایسا حاکم ہے جس کو نہ کوئی معزول کرسکتا ہے اور نہ اس کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔(۳) خود نفسِ ایمان اصطلاح میں مابعد الطبیعی ہے۔ایمان نام ہی ہے الغیب پر یقین کا۔(۴) لہٰذا اس کے اولین یا واحد مخاطب، یعنی عقل کے اندر مابعد الطبیعی حقائق اور امور کی قبولیت اور اثبات کا مادہ ایک تو خِلقی ہونا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اس مادہ تعقل کی بنیاد پر عقل کے ارادی استعمال سے کچھ ایسے نتائج ضرور اس کے کریڈٹ میں ہونے چاہئیں جو اس دعوے کو محتاجِ دلیل نہ رہنے دیتے ہوں کہ عقل مابعد الطبیعیت (metaphysicality) سے ایک خِلقی مناسبت بھی رکھتی ہے اور اسے اپنے تخیلات ،تصورات اور افکار کی تشکیل میں استعمال بھی کرتی ہے۔اسی بات کو فلسفیانہ تناظر میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ عقل اپنے معروض (object) سے تین طرح کا تعلق لازما رکھتی ہے۔پہلا تو یہ کہ یہ اسے ایک ادراکی کل کا حصہ بناتی ہے، دوسرا یہ کہ اس کی تجرید کرتی ہے، اور تیسرا یہ کہ اس معروض کے ساتھ اپنی ماورائیت اور غیریت کو برقرار رکھتی ہے۔

مناہج تعقل اور مابعد الطبیعی

یہ تینوں منہج تعقل، عقل کے بارے میں اس بات کو یقین سے کہنا ممکن بنا دیتے ہیں کہ اس کی تمام فعلیت ایک مابعد الطبیعی اساس رکھتی ہے، جس کی مستقل کارفرمائی کی وجہ سے عقل، معقولات کو اشیا کی حیثیت سے اپنے باہر نہیں بلکہ تصور وغیرہ کی سطح پر اپنے اندر تشکیل دیتی ہے۔ اپنے معروضات سے ماورائیت (transcendence) کا یہ مستقل مزاج اتنا باور کروانے کیلئے کافی ہے کہ عقل، اپنی لائقِ ادراک ساخت

---

* پروفیسر شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور

میں بھی ایک ایسا مابعد الطبعی پن رکھتی ہے جس کا مصداق میسر نہ آئے تو بھی وہ تعقل کے تمام دائروں میں مرکزی حیثیت سے اپنا موثر کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ عقل کو بدل کر اگر ذہن کی اصطلاح استعمال کی جائے تو بھی پوری بات یہی رہتی ہے کہ ذہن علم کو مسلمات میں ڈھالنے کی جو ایک مستقل اور مطلق خواہش رکھتا ہے، وہی اس کا جوہر ہے۔

ذہن کے لئے مفید شعور اور موجب علم مادہ

دوسری طرف محسوسات ذہن کیلئے کبھی مسلمات نہیں بن پاتے کیونکہ ان کی صورت میں استقلال تو ہوسکتا ہے لیکن معنی میں نہیں۔ یعنی صورت کے ساتھ معنی بھی اگر مستقل نہ ہوجائیں تو ذہن اپنے معلومات کو مسلمات کا درجہ نہیں دیتا۔ اسی لئے حسی اور تجربی علوم، ذہن کے اندر تسلیم کی ایسی فضا نہیں پیدا کرتے جس کی بدولت یہ کسی خاص رخ پر اپنی تفتیشی حرکت کو روک لے اور کسی خاص معاملے میں سوال کی حالت سے نکل آئے۔ ذہن کی یہ مطلوبہ حالتِ تسلیم علم کے مقابلے میں ایمان سے زیادہ سازگاری رکھتی ہے اور شہود کی نسبت غیاب سے زیادہ مناسبت۔ ذہن کا یہ مادہ جو ایمان کو مفیدِ شعور اور موجبِ علم بنا لیتا ہے اگر ذہن کو درکار آزادی اور مقصدیت کے ساتھ اپنی نشو و نما کے عارضی اور مستقل مراحل سے گزرتا ہے تو ایمانیات بھی شعور کے وسعت پذیر دائروں میں اپنی حتمی مرکزیت نہ صرف یہ کہ برقرار رکھ سکتے ہیں بلکہ یہ شعور کی متنوع فعلیتوں کی مستقل اور transcendental اساس بھی بن سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایمان کا main character یعنی خدا، معلوم ہونے اور موجود ہونے کی ذہنی اور خارجی کلیتوں کو اپنے اقرار میں، شعور کیلئے موجبِ تسکین اقرار میں، ایک کر دیتا ہے۔

وجود اور شعور کی دوئی کا خاتمہ

یہاں اقرار کا ذکر اس لئے کیا کہ ایک تو خود ایمان اقرار ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ شعور انکار کو محفوظ نہیں رکھتا، یہ کسی چیز کا اقرار کر کے ہی اپنے موقف کی تعمیر کرتا ہے۔ انکار شعور کا فعل تو ہے حال نہیں، ورنہ شعور ایک خلا میں بدل کر رہ جائے۔ اس کا ہر انکار یا تو کسی اقرار کی بنیاد پر ہوتا ہے یا اس اقرار کی تکمیل کیلئے ہوتا ہے۔ شعور کی اس بناوٹ کا، یعنی مبنی بر اقرار بناوٹ کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ اس کیلئے سب سے بڑا مسئلہ بلکہ مقصودِ واحد یہ ہے کہ اسے وہ حال حاصل ہوجائے جہاں ذہنی اور خارجی یا زیادہ واضح لفظوں میں، وجود اور شعور کی دوئی ختم ہوجائے۔ اس کیلئے یہ کوئی ایسا کلی مفروضہ یا تصور ڈھونڈنے اور تشکیل دینے میں لگا رہتا ہے جس میں پہنچ کر وجود اور علم ایک ایسی اکائی میں ڈھل جائیں کہ ایک کا نام دوسرے پر صادق آسکے۔ یہ شعور کی ایمانی ساخت ہے اور یہ مطالبہ شعور کی ایمانی ساخت کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔

خدا کو مان لینا اسی اقتضا کی حتمی تسکین اور تکمیل کر دیتا ہے۔ ذہن کے پاس خدا کے سوا کوئی ایسا وحدت ساز تصور موجود نہیں ہے جو معلوم اور موجود کی حقیقی عینیت کا نہ صرف یہ کہ احاطہ کر لے بلکہ وجود اور شعور کی اطلاقی کثرت کو ہم اصل بنا دے۔

ایمان کیلئے ناگزیر علمی تشکیلات

یہی وجہ ہے کہ علم کا کل اپنے مابعد الطبعی جوہر پر استواری کی حالت میں جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی ایمان کے محتوا (content) یعنی وجود کے کل کے ساتھ اس کی موافقت ترقی کرتے کرتے ایک ایسی عینیت تک پہنچ جائے گا جہاں ذہن موضوع و معروض کی دوئی (subject-object duality) کو خارجی اقلیم میں برقرار رکھتا ہے، لیکن داخلی اقلیم میں یہ دوئی حاضر فی الادراک نہیں رہتی۔ ویسے بھی ذہن اور اس کے معروض میں اور سے تعبیر کیا جا سکنے والا فاصلہ وجودی اصطلاح میں کبھی ختم نہیں ہوتا البتہ علم کے حتمی تناظر میں اس کا استحضار نہیں رہتا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ذہن میں حقائق کے عنوان سے ایک ایسی سطح رونما ہو جاتی ہے جس کے تجربے سے علم تصور اور تصدیق کی معروف correspondence سے نکل جاتا ہے اور اسے ان دونوں میں امتیاز کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ تیقن کا آخری درجہ ہے جس کے حصول کی بدولت وجود کی مابعد الطبعیت یا مطلق ماورائیت ذہن میں محصور ہو جانے کا تاثر اور تصور پیدا کئے بغیر خود ذہن کیلئے انتہائی مرتبے پر حقیقی ہو جاتی ہے۔ یہی ذہن کا وہ انفعال ہے جس کے عمل میں آئے بغیر ذہن کو ادراک، تخیل وغیرہ کا بنیادی مادہ میسر نہیں آ سکتا۔ ایمان کی علمی تشکیلات جو ناگزیر ہیں، انکے process کو سمجھنے کیلئے علم کی اس تعریف کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس کے مطابق علم اپنی تکمیلی صورت اور حالت میں موضوع اور معروض دونوں کی خودورائی (self transcendence) کے شعور میں آ جانے کا نام ہے یعنی شے اپنے رسمی (formal) وجودی حدود اور ذہن اپنے معمول کے ادراکی قیود سے ورائیت حاصل کئے بغیر علم کے اتمام و کمال یعنی مذہبی اصطلاح میں تیقن اور علمیاتی اصطلاح میں اس مستقل تناظر تک نہیں پہنچ سکتا جس تک رسائی ہوئے بغیر جاننے کا عمل ماننے پر منتج نہیں ہوتا۔ ایمان اپنی ساخت ہی میں جاننے اور ماننے کی ایسی اکائی کا نام ہے جس میں پہلا عنصر مغلوب رہتا ہے اور دوسرا غالب۔ یہی ہر طرح کے علم کا بنیادی حال ہے۔ ہر طرح کے علم سے مراد حقیقت کو اپنا ہدف بنانے والے علوم ہیں۔

ایمانی شعور کے فلسفیانہ نتائج

شعور کی مابعد الطبعیات سے مناسبت کا بڑا اظہار چونکہ فلسفے میں ہوا ہے لہٰذا فلسفے کو نہ مانتے ہوئے بھی اسے جاننا ذہن کی ایمانی استعداد کو بڑھا سکتا ہے۔ دینی ذہن کا فلسفے سے جو بھی مفاد ہے وہ

بہت بنیادی ہوتے ہوئے بھی بس اتنا ہے کہ مابعد الطبعی امور سے مناسبت رکھنے والے ذہن کو ایمان کی تکمیل کیلئے درکار صلاحیتِ تصور بھی حاصل ہوجائے اور قوتِ تصدیق بھی۔ ایمانی شعور کو فلسفیانہ نتائج اور نظریات سے کچھ نہیں لینا ہوتا لیکن فلسفیانہ صلاحیت کا فقدان یا اس سے بے خبری کی بنیاد پر وجود میں آنے والی بے نیازی اس کیلئے کچھ پہلوؤں سے مضر ہوسکتی ہے۔ ان میں سے سب سے بڑا پہلو وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ الغیب سے وہ مناسبت نصیب نہیں ہوتی جو ذہن کو اس کی فعلیت اور انفعال دونوں کے ساتھ ایمان سے متعلق رکھتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ الغیب اگر ذہن کیلئے بھی موجبِ تسکین نہ ہو تو ایمان کے کئی مطالبات جو ذہنی بھی ہوسکتے ہیں اور عملی بھی، پورے نہیں ہوسکتے۔

فلسفہ سے بنیادی آگاہی کی ضرورت

یہ دیکھنا بھی مفید ہوگا کی ایمان ایک بہت مرکزی جہت سے ام الشعور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے شعور کی تمام انواع کی کفالت ہوتی ہے یا ہونی چاہیئے۔ مجموعی شعور میں اپنی مستقل faculties کے درمیان ایک وحدت خیز تعلق کا جو نظام چل رہا ہے اگر ایمانی ذہن اس سارے نظام اور mechanism کو تصرف میں نہیں لاتا تو پھر ایمان کا ام الشعور ہونا خود اس سے اوجھل رہ جائے گا، اور یہ مجموعی شعور کیساتھ ساتھ خود ایمانی شعور کیلئے بھی نقص کی بات ہوگی۔ قدیم سے آج تک مجموعی شعور کے mechanics اور اس کے تالیفی دروبست کی تحقیق کا جو بھی کام ہوا ہے اس میں فلسفے کا حصہ دیگر علوم سے زیادہ ہے۔ تو ان معنوں میں بھی فلسفے سے بنیادی آگاہی ضروری ہے تاکہ ایمان کا بڑا مقصود یعنی شعور پر اس کی حاکمیت، نظرانداز نہ ہوجائے۔ فلسفے کی صحت یقیناً جزوی، عارضی اور مشتبہ ہے، تاہم ایک ذہنی صلاحیت کے طور پر اس پر دسترس ہونا اسلئے بھی تقریباً ناگزیر ہے کہ اس کی مدد سے ایمانیات ذہن کیلئے اجنبی اور علم کے دائرے سے لاتعلق نہیں رہتے۔

ذہن معانی کا گھر

ایک اور پہلو سے بھی فلسفہ ذہن کی ایک بنیادی استعداد کو بیدار کرنے میں بڑا کردار رکھتا ہے۔ ہائیڈیگر کے بقول زبان وجود کا گھر ہے۔(۵) ذہن کی ایک خاص قوت معنی کو صورت سے آزاد رکھنے یا کروانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کی ذرا سی تفصیل یہ ہے کہ ذہن معانی کا گھر ہے، وہ معانی جو صورت سے حاصل ہوکر بھی صورت سے زیادہ کامل ہوتے ہیں۔ ویسے معنی کی تعریف ہی یہ ہے کہ ادراک میں آکر شے خود اپنے اظہار کے حدود و قیود کو توڑ دیتی ہے۔ معلوم شے صورت کے قوانین کے ساتھ موجود شے سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر ذہن اپنے معروضات سے ایک ایسا تعلق رکھتا ہے جس میں وہ شے سے موافقت کو ملحوظ رکھتا ہے لیکن اس میں محدود نہیں رہتا۔ شے کو اپنا موضوع بنا کر اور اس کے صحیح ادراک کو

حاصل کرنے کا قصد کر کے بھی ذہن شے کے ساتھ برائیت کی ایک فعال نسبت ضرور رکھتا ہے اور اسی نسبت کی بدولت معنی وجود میں آتے ہیں۔ یہ صورت اور معنی کا وہ تعاملی نظام (Interactive Process) ہے جو ذہن کی فطرت میں داخل ہے، اور انسان کے پیدا کئے ہوئے تمام علوم میں سے ایک فلسفہ ہی ہے جو اس نظام کو غیر شعوری نہیں رہنے دیتا بلکہ ادراک اور تصرف میں لے آتا ہے۔ فلسفے کی بیشتر روایتوں میں ایک مزاجِ علم مشترک ہے اور وہ ہے علامتیت (Symbolism) کا مزاج۔ علامتیت (Symbolism) سے حتمی مراد یہ ہے کہ شے اپنے مراتبِ ہستی کو اور اپنے حقائقِ وجود کو خود سے منکشف نہیں کرتی بلکہ یہ ذہن ہے جو شے پر عمل کر کے ان مراتب و مدارج کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ انکشاف اپنی clinical ساخت میں ظاہر ہے کہ تصور ہی ہے، لیکن یہ تصور ایسا ہے جو تصدیق سے متعلق مگر اس پر حاکم ہوتا ہے۔ علامت (Symbol) یہی ہے۔ شے سے متعلق اور اس پر حاکم۔ اس علامتیت (Symbolism) سے مانوس ہو کر شعور میں جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ ایمانیات کیلئے سازگار ہے۔ یعنی سارا کارخانہ شہود اپنے تمام تر علمی و عینی پھیلاو کے ساتھ غیب پر دلالت کرتا ہے، وہ غیب جو علم اور وجود، دونوں کی اصل ہے اور جس کا محل ذہن اور شے کے جبری تعلق سے مطلقاً ماورا ہوتے ہوئے بھی اگر کہیں ہے تو وہ ذہن ہے، شے مشہود نہیں۔

فلسفہ دانی ایک ضرورت

فلسفے کی اصطلاح میں علامت (Symbol) کا جوہر یا مبدا و مرجع حقیقت ہے۔ فلفسیانہ ذہن اس حقیقت کو تجرید، تخییل، تعقل وغیرہ کی مدد سے مجملاً لائقِ ادراک اور مفصلاً قابلِ اثبات بناتا ہے۔ اگر فلسفے کے طریقہ کار تک رہا جائے اور اس کے مقاصد سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو حقیقت اور ذہن یا عقل کے تعلق کی دریافت کیلئے کی جانے والی تمام ذہنی کاوشیں ایمان سے مانوس کر دینے والی ایک نتیجہ خیز قوت میں ڈھل سکتی ہیں۔ جس ذہن میں معنی کی تعمیر کا عمل اس سطح پر نہ ہو رہا ہو جو اوپر بیان ہوئی ہے تو وہ ذہن ایمانیات کا خود اپنے لئے قابلِ اعتبار مخاطب یا حامل نہیں بن سکتا۔ اس لحاظ سے بھی فلسفے سے اصولی طور پر باخبر رہنا ایمانی ذہن کیلئے مفید ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ ایمان محض ذہنی construct نہیں ہے، اس کی تقویت اور تکمیل کا سارا عمل عقلی اور ذہنی نہیں ہے، لیکن اگر مقصود یہ ہے کہ ذہن کو ایمان کا ظرف بنایا جائے تو پھر اوپر ذکر کی گئی چیزیں جواز اور افادیت رکھتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی ایسا دعوی نہیں کیا جا سکتا جس سے یہ تاثر ملتا ہو کہ فلسفہ دانی خود ایمان کی ضرورت ہے۔

فلسفیانہ علوم ریاضی اور منطق

فلسفے نے کم از کم دو ایسے علوم پیدا کئے ہیں جنہیں نظر انداز کر کے ایمان پر استدلال کرنے والا علمِ کلام وجود ہی میں نہیں آ سکتا۔ اور وہ دو علوم ریاضی اور منطق ہیں۔ ریاضی سے حقیقت کا موجود فی الخارج

ہونا ثابت ہوسکتا ہے اور منطق سے اس کا موجود فی الذہن ہونا۔اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ ریاضی نے لامتناہی (infinite) کوموجبِ ادراک بنادیا۔ ریاضی نے لامتناہی کو soul of all definitions کے طور پر منوالیا ہے۔اس بنیاد پر ریاضی میں دیگرانسانی علوم کے مقابلے میں اثباتِ وجودِ باری کی استعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔خارج کا تحقق ہی اگر غیرمتناہی کے اثبات سے مشروط ہوجائے تو اس سے خدا کے موجود ہونے پرایمان لانا عقل کیلئے بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ جہاں تک منطق کا تعلق ہےتو منطق کلیات کو منبعِ علم بنانے سے عبارت ہے۔کلی کی ذہن میں وہی حیثیت ہے جو لامتناہی کی خارج میں ہے۔کلیات کو مقومِ وجود اور معروف شے مان لینے سے اوراسے علم کی تشکیل میں لازم ٹھہرالینے سے منطق میں حق اورشعور کے تعلق کی ایک فطری عقلی بنیاد حاصل ہوجاتی ہے۔یعنی کلیات جو categories of knowledge and being دونوں ہیں اگر نظامِ شعور و وجود میں اول و آخر کی حیثیت اختیار کرلیں تو ذہن ایمان بالغیب سے بدیہی مناسبت پیدا کرلیتا ہے یا کرسکتا ہے۔گویا اثباتِ حق کی تصدیقی ضرورت ریاضی سے پوری ہوسکتی ہے اور تصوری لوازم منطق سے فراہم ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ نفسِ حق ان کا اپنا تصور اورمفروضہ نہ ہو بلکہ وحی سے پہنچا ہو۔

ایمانی مقاصد اور فلسفیانہ علوم

حقیقت کا موجود فی الخارج اور موجود فی الذہن ہونا،ایمانی مقاصد کے ساتھ حق کی تصدیقات کے ذہنی اور خارجی locales یہی ہیں۔ بہت آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کو باعتبارِ تنزیہ وتشبیہ اور بلحاظ انفس وآفاق جاننے اور ماننے کے ایمانی مقاصد میں ریاضی اور منطق پر تبحر کتنا مددگار ہوسکتا ہے! تاہم یہ خیال رہے کہ فلسفے سے حاصل ہونے والا علم، ذہن کے ایمانی structures کومنہدم کرسکتا ہے، اس سے علم کا مفاد نہیں رکھا جاسکتا، البتہ اسے استعدادِ علم میں اضافے کا ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات دہرا دینا غیرمناسب نہ ہوگا کہ فلسفہ ذہن میں غیب کی قبولیت کو ابھارتا ہے لیکن خود غیب کیا ہے؟ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ یہ معرفت وحی سے میسر آتی ہے جو ذہن میں ایمان کو علم پر حاوی رکھنے کا واحد وسیلہ ہے۔ (بشکریہ دانش ڈاٹ پی کے)

(حواشی)

(۱) دیکھئے: Plato, Phaedo, The Dialogues of Plato. New York: Bentham Books, 2006

(۲) دیکھئے: Plato, Apology, The Dialogues of Plato. New York: Bentham Books, 2006.

(۳) دیکھئے، المستصفی، ابوحامد غزالی، بیروت: دارالکتب العلمی، ۲۰۰۰، ص۳ (۴) دیکھئے: القرآن ۲:۳

(۵) دیکھئے: Martin Heidegger, Letter on Humanism, Basic Writtings. London: Harper Perennial, 2008.